گے۔ پھر دونوں طرف کے خاص خاص علماء کرام کا مشترک اجلاس ہوگا۔ پھر نسبۃً بڑے پیمانے پر دونوں طرف کے حضرات کا دوسرا اجلاس ہوگا۔ ان اجلاسوں میں اتفاق ہو جانے کے بعد ملک گیر پیمانے پر دونوں طرف کے علماء ومشائخ کا کنونشن بلا کر ان میں اعلان کر دیا جائے گا کہ عقائد میں ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔'' (مجلّہ ''المصطفیٰ''، بہاولپور، امام اہل السنۃ نمبر، رجب تا شعبان ۱۴۳۰ھ، ص ۳۷۴، ۳۷۵)

مولانا مفتی عبد الشکور ترمذی کے نام خط سے اقتباس:

''احقر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب عذاب قبر کے علی الاطلاق منکر نہیں بلکہ برزخ میں روح کے عذاب وثواب کے قائل ہیں۔ جسد عنصری کے ساتھ روح کے عذاب وثواب کے قائل نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ عالم برزخ کا عذاب اجسام مثالیہ کی وساطت سے روح پر وارد ہوتا ہے۔ یہ بات اگرچہ جمہور اہل سنت کے مسلک کے خلاف ہے، لیکن کسی نص صریح کے بھی خلاف ہے؟..... خلاصہ کلام یہ کہ اس مضمون کے پڑھنے سے یہ بات سامنے آئی کہ ان کا مسلک اتنا غلط اور بے بنیاد نہیں جتنا کہ یہ سننے سے سمجھا تھا کہ ''وہ عذاب قبر کے منکر ہیں۔'' بہر حال ان کا مسلک علماء دیوبند اور جمہور سے مختلف ضرور ہے۔ اگر قرآن کریم یا سنت کی کوئی نص صریح صحیح ان کے مسلک کے ابطال پر آنجناب کے علم میں آئی ہو تو ضرور مطلع فرمائیں۔'' (مجلّہ ''الحقانیہ''، ساہیوال، ستمبر ۲۰۱۰ء)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''پچھلے چند سال سے اور بالخصوص گزشتہ چند مہینوں سے ایسی ایسی شخصیتیں اٹھ رہی ہیں جن کا صدمہ کسی ایک فرد، انجمن یا ادارے کا نہیں بلکہ پوری ملت کا صدمہ ہوتا ہے۔..... ان کا شمار حضرت تھانوی کے خلفاء میں تو نہیں، لیکن ممتاز متوسلین میں ضرور تھا۔ وہ حضرت تھانویؒ کے عاشق تھے اور اپنی تحریروں میں جگہ جگہ حضرت کو مرشد تھانوی کے لقب سے یاد کرتے ہیں، لیکن بہت سے معاملات میں ان کی رائے حضرت تھانوی سے مختلف رہی ہے۔ حضرت سے متعدد مسائل پر سوال وجواب ہوئے اور مولانا دریابادیؒ حضرت کی فہمائش کے بعد بھی اپنی رائے پر قائم رہے۔ اس کے باوجود تعلق اور عقیدت میں فرق نہیں آیا۔..... ان کا قلم صحیح معنی میں بے باک اور نڈر تھا۔ انھوں نے جس بات کو درست سمجھا، اس کے اظہار میں ان کو نہ کبھی حکومت کا خوف دامن گیر ہوا اور نہ عوام یا رائے عامہ کا۔ وہ آخر تک اپنی رائے کا اظہار بے خوف وخطر کرتے رہے، خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔ قادیانیت کے مسئلے میں ان کا نرم گوشہ پوری امت کے خلاف تھا اور بلاشبہ یہ ان کی سنگین ترین غلطی تھی جس پر اللہ ان کی مغفرت فرمائے، لیکن وہ پوری امت کی مخالفت کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے۔ عفا اللہ تعالیٰ عنہ وغفرلہ۔'' (نقوش رفتگان، ص ۷۹، ۸۰)

جناب ماہر القادری کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''ماہر صاحب اگرچہ کسی بھی جماعت سے باضابطہ وابستہ نہ تھے، لیکن مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے وہ

اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے عقیدت مند ہی نہیں، بلکہ اس معاملے میں مغلوب الحال ہو گئے تھے۔.....ایک روز میں نے ان کے ایک خط کے جواب میں مولانا مودودی کے تفردات کے بارے میں کوئی جملہ لکھ دیا تھا۔ آٹھ دس روز کے بعد ان کی طرف سے ایک پارسل ڈاک میں موصول ہوا۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی مقالہ ہوگا، لیکن کھولا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ وہ میرے اس مختصر خط کا جواب تھا جو اڑتیس صفحات پر مشتمل تھا۔ مجھے اس کے مندرجات سے تو اتفاق نہ ہو سکا، لیکن اس بات کی بڑی قدر ہوئی کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، صرف ایک آدمی کو اس کی تبلیغ کرنے کے لیے انھوں نے اتنی محنت اور اتنا وقت خرچ کیا۔'' (نقوش رفتگان، ص ۱۲۸)

مولانا غلام اللہ خان کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''آپ نے تفسیر ''جواہر القرآن'' جیسی ضخیم کتاب بھی تصنیف فرمائی جو حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری افادات ونظریات کی بہترین تشریح ہے۔ بعض مسائل میں اکابر علمائے دیوبند سے قدرے مختلف موقف رکھنے کے باوجود اکابر کی عظمت ومحبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔.....بحمد اللہ برادرم محترم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم اور اس ناکارہ کو ہمیشہ ان کی شفقت ومحبت حاصل رہی۔ بارہا دارالعلوم میں ان کی تشریف آوری ہوئی۔ یہاں درس وخطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔ علمی وعملی کمالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی ذات ہم سب کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔'' (نقوش رفتگان، ص ۱۳۹)

مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیلؒ کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''مولانا ہمارے ملک کے ان ممتاز اور جید علماء میں سے تھے جن کی طرف ملک وملت کے ہر اجتماعی مسئلے میں نگاہیں اٹھتی تھیں۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے نہ صرف فارغ التحصیل تھے، بلکہ انھوں نے کچھ عرصہ وہاں تدریس کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ تمام دینی علوم پر ان کی بڑی وسیع نگاہ تھی اور بالخصوص فقہ وفتویٰ کے ساتھ خصوصی شغف تھا۔.....

قدرت نے مولانا کے ساتھ ایک طویل رفاقت کی سعادت عطا فرمائی۔ صدر ضیاء الحق صاحب کے ابتدائی عہد حکومت میں جب اسلامی نظریاتی کونسل دوبارہ تشکیل دی گئی تو اس میں مولانا بھی رکن بنے اور یہ ناکارہ بھی۔ اس طرح تقریباً تین سال مولانا کے ساتھ دن رات کام کرنے کا موقع ملا۔.....

مفتی صاحب سیاسی اور دعوتی معاملات میں مولانا مودودی صاحب مرحوم اور جماعت اسلامی سے نہ صرف متفق بلکہ ان سے آخر تک پوری طرح وابستہ رہے اور اس لحاظ سے ان کا طرز فکر وعمل عام علماء دیوبند سے مختلف تھا۔ اس سلسلے میں وہ جماعت اسلامی کا بڑے زور وشور کے ساتھ دفاع بھی کرتے تھے، لیکن فقہ وعقائد کے معاملے میں بسا اوقات ان کی رائے عام علمائے دیوبند ہی کے ساتھ رہتی اور وہ ان معاملات میں مولانا مودودیؒ سے اختلاف کا اظہار بھی فرماتے تھے۔.....مولانا مودودی کی جن آراء شاذہ سے مفتی صاحب کو اختلاف تھا، ان کے باوجود وہ ان کے لٹریچر کو بحیثیت مجموعی نہایت مفید سمجھتے اور لوگوں کو اسے پڑھنے کی تبلیغ بھی فرماتے تھے۔'' (نقوش رفتگان، ص ۲۵۴ تا ۲۵۷)

جماعت اسلامی کے نائب امیر پروفیسر خورشید احمد صاحب کے قائم کردہ ادارے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،

اسلام آباد میں گفتگو:

''میں جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی شفقت کی بنا پر مجھے اس ادارے میں قوانین حدود سے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ جناب پروفیسر خورشید صاحب میرے استاد ہیں۔ میں نے ایک مختصر عرصہ سہی، ان سے معاشیات کا درس لیا ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس لیے ان کی فرمائش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے اور اسی کی تعمیل میں اس وقت میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔'' (''حدود قوانین: موجودہ بحث اور آئندہ لائحہ عمل''، ص ۷)

مولانا ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

''یہ ٹھیک ہے کہ یونانی منطق اور فلسفہ سے اشتغال رکھنے والے بہت سے لوگوں نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا جو اسلام کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ آپ فارابی کی کوئی کتاب پڑھیں۔ مثلاً اس کی کتاب ہے 'آراء اہل المدینہ الفاضلۃ' جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم سیاسی فکر کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلامی تعلیم وعقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن ایک اعتبار سے وہ بڑی غیر معمولی کتاب ہے کہ اس نے یونانی علوم وفنون پڑھے اور ارسطو کی Politica یعنی 'سیاسیات' کا ترجمہ اس نے پڑھا۔ شاید افلاطون کی Republic کا بھی ترجمہ دیکھا ہو، لیکن بظاہر اس کے شواہد کم ہیں۔ سیاسیات پر وہ ارسطو کے نقطہ نظر سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی اور کوشش کی کہ ان خیالات کو اسلام سے ہم آہنگ کر کے بیان کرے۔ میرے خیال میں یہ Islamization of Knowledge کی پہلی کوشش تھی۔ یہ داعیہ اس کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ وہ یونانیوں کے خیالات کو اسلام کے مطابق بنائے؟ اس کے دل میں کوئی اسلامی حمیت تھی اور کوئی اسلامی جذبہ تھا تو پیدا ہوا۔ اس اسلامی جذبے نے اس کو ارسطو کے خیالات کو جوں کا توں مسلمانوں میں پیش کرنے سے باز رکھا اور اس حد تک اس کا اسلامی فہم قابل ستایش ہے۔ اس کے مطابق اس نے ایک ایسی چیز کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر لوگوں کی رہنمائی۔ اس نے اسلام کی سیاسی فکر اور اس کے دستوری تصورات کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ نقل کے معیار کے ساتھ ساتھ عقل کے معیار پر بھی پورا اترے۔ اسی وجہ سے میں ابن سینا اور فارابی کا بڑا احترام کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، اس کے باوجود کہ ان کے بہت سے خیالات اسلامی عقائد سے متعارض ہیں۔'' (ماہنامہ ''الشریعہ''، مارچ ۲۰۰۵ء)

مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ کے انتقال پر

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا تعزیتی شذرہ

اس ملک کے دینی حلقوں کے لیے ایک بڑا سانحہ حال میں مولانا عبید اللہ انور مرحوم کے انتقال کی صورت میں پیش آیا۔ مولانا درس وتعلیم قرآن کے اس قدیم سلسلے کے اس وقت سربراہ تھے جو مولانا احمد علی رحمۃ اللہ عیہ کے زمانے سے لاہور میں جاری تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑا ہی مبارک اور وسیع سلسلہ تھا۔ اس کی شہرت میں یوپی میں بھی سنا کرتا تھا۔ بلا مبالغہ ہزاروں انسانوں نے اس حلقہ درس سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی خاص خوبی یہ رہی کہ مولانا احمد علی اور مولانا عبید اللہ انور دونوں نے قرآن کے درس کا کام للہ اور فی اللہ کیا اور بڑے وسیع حلقے میں قرآن مجید کا فیض پہنچایا، لیکن اس زمانے میں قرآن کے نام پر جو دکانیں کھلتی اور پلازے قائم ہوتے ہیں، اس طرح کی کوئی چیز انھوں نے قائم نہیں کی۔

اس حلقہ درس سے متعلق میرے لیے خاص دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ہر چند یہ سلسلہ درس تھا تو اسی معروف طریقے پر جو اس ملک کے پرانے علماء کا طریقہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا احمد علی اور مولانا عبید اللہ انور مرحوم دونوں کے قلب میں بڑی وسعت تھی، اعتدال اور میانہ روی تھی۔ وہ نئے افکار، نئے طرز تحقیق اور فکر وتدبر سے متوحش یا الرجک نہیں تھے، بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ اس کو پسند کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ رسالہ ''خدام الدین'' میں ہمارے رسالہ ''تدبر'' پر جب تبصرہ ہوا تو اس کے تحقیقی اور علمی رنگ کو پسند کرتے ہوئے اسے بہر طور لائق مطالعہ قرار دیا گیا اور اہل علم کو اس سلسلہ کی سرپرستی کرنے کی سفارش کی گئی۔ قلب کی یہ وسعت وگنجائش خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ چیز اس توسع اور فراخ دلی کے لیے راستہ کھولے گی جو اس دنیا میں ہم کو بنیان مرصوص بنا سکتی ہے۔

میرے خیال میں اس مکتب فکر کو یہ روشنی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے ورثے میں ملی ہے۔ شاید آپ لوگوں کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ مولانا سندھیؒ میرے استاد مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے۔ استاد مرحوم ان کا ذکر بڑی محبت سے ''ہمارے مولانا عبید اللہ'' کے الفاظ سے کرتے۔ جب مولانا سندھی عرب میں تھے تو مولانا فراہی ہندوستان سے جانے والے حجاج کے ذریعے ان سے تعلق رکھتے اور جب وہ خود حج کے لیے گئے تو مولانا سندھی سے وہاں ان کی ملاقاتیں رہیں اور واپسی پر انھوں نے مولانا کے بعض

نہایت موثر واقعات ہمیں بھی سنائے۔ مولانا سندھی جب کبھی اعظم گڑھ تشریف لاتے تو وہ مولانا فراہیؒ کے مہمان ہوتے۔ اسی طرح مجھے ذاتی طور پر ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ میں ہمیشہ اس مسئلے پر غور کرتا کہ مولانا فراہیؒ اور مولانا سندھی کے سوچنے کے انداز میں بڑا فرق ہے۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے دونوں کو اتنا جگری دوست بنا رکھا ہے۔ واقعات نے مجھے پر یہ واضح کر دیا کہ مولانا فراہی قدردان تھے مولانا سندھی کے مضبوط کردار، ان کی عزیمت، ان کی استقامت، ان کے استغنا، ان کی شجاعت، فتوت اور خلق سے ان کی بے نیازی کے۔ مولانا سندھی مداح تھے مولانا فراہی کے تفکر وتدبر اور قرآن مجید کے گہرے علم کے۔ اس چیز نے دونوں کی سوچ کا انداز الگ الگ ہونے کے باوجود ان میں گہری محبت پیدا کر دی تھی۔

مولانا فراہی کے انتقال کے بعد بھی مولانا عبید اللہ سندھی ایک مرتبہ مدرسۃ الاصلاح میں تشریف لائے اور مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا۔ رسالہ الاصلاح کے نکالنے کی تاریخ قریب تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مولانا سندھی مدرسے میں تشریف فرما ہوں اور رسالے میں ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس زمانے میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی طاقت ان میں ذرا کم ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے آپ پر مضمون لکھنا ہے، لیکن چھپنے سے پہلے وہ آپ کو دکھاؤں گا نہیں۔ بڑی محبت کے ساتھ ہنس کر کہنے لگے، اچھا بھائی، آپ ایڈیٹر ہیں۔ آپ کو اختیار ہے، نہ دکھائیے۔ میں نے وہ مضمون لکھا اور اس میں مولانا کے افکار سے اپنا اختلاف بھی ظاہر کیا۔ اس کا پروف میں نے مولانا کو دکھایا۔ انھوں نے اسے بڑے انہماک سے پڑھا اور واپس کرتے ہوئے کہا، ''اچھا بھائی، ٹھیک ہے۔'' میرے نزدیک ان کے اندر فکر کی آزادی تھی اور وہ اس کے قدردان تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے افکار کے علمبردار تھے اور یہ بات معلوم ہے کہ شاہ صاحب کے ہاں بھی فکری آزادی موجود ہے۔ فکر وتدبر کی قدر انھی بزرگوں سے مولانا احمد علیؒ کے خاندان میں بھی ایک اعتدال کے ساتھ منتقل ہوئی ہے اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔

مولانا عبید اللہ انور کے انتقال کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں آخرت میں سرخرو اور فائز المرام کرے۔ میری یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے صاحب زادوں، رفقاء اور تلامذہ کو توفیق دے کہ وہ ان کے کام کو مزید سرگرمی کے ساتھ جاری رکھیں اور مولانا احمد علی کے شروع کیے ہوئے مبارک سلسلہ درس کا فیض عام جاری رہے۔

(رسالہ ''تدبر''، مئی ۱۹۸۵ء)